نازیہ انصاری
لیکچرر اردو، انسٹیٹیوٹ آف سدرن پنجاب۔ ملتان

ڈاکٹر امتیاز حسین بلوچ
صدر شعبہ اردو، انسٹیٹیوٹ آف سدرن پنجاب۔ ملتان

Nazia Ansari
Lecturer Urdu, Institute of Southern Punjab. Multan

Dr. Imtiaz Hussain Baloch
Chairperson Urdu Department, Institute of Southern Punjab. Multan

انور سن رائے کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ

A Critical Review of Anwar Sun Roy's Novels

ABSTRACT: Prominent novelist, Poet, translator and journalist of Urdu literature Anwar Sin Roy do not need any introduction. He is a journalist who has been associated with many institutions. His analysis on Pakistani Political and literary history is no less than a book even is one line. He has a keen eye on the Political and social changes taking Place at the international level. Anwar's novel "cheekh" has its own identity In Urdu literature. In this novel, he has made martial law the subject, and he describes the effects of dictatorship on the Country and nation in a bold way. He is a bold Journalist. He has made women the Subject in his second novel "Zilllaton ke Aseer" in this novel, he has expressed his thoughts on the movement of Feminism, which was born under the influence of western literature, and debate has raised the voice for the rights of man and woman. His other works include translations of Mahmood Darwish and Uduin's Poems, both of his novels are important in terms of subject matter. These are topics that have become the tragedy of Society. These are such Problems. The People of Pakistan have been suffering from this ever since the establishment Pakistan.

Key Words: novelist, cheekh, martial law, Feminism,

انفرادی، تہذیب، بحثیت، استحصال، چیخ، مستزاد، مزاحمتی، جھپکنا، استوار، سیسہ، جبر واستبداد، پدر سری، تانیثیت، نفسیاتی، فصیح

تخلیق، ادیب کا انفرادی تجربہ اور شخصی اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ عصری تہذیب اور سماجی رشتوں سے بھی جڑی ہوتی ہے۔ تہذیب کے جبر اور سماجی رشتوں سے نجات حاصل کرنا ایک ادیب کے لئے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ ایک ادیب کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ایسا ادب تخلیق کرے جو مستقبل کے لئے ہو۔ بلکہ اسے ایسا ادب تخلیق کرنے پر بھی ملکہ حاصل ہونا چاہیے کہ جو صرف اس ایک لمحے کے لیے ہو۔ جس میں اس کی قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو۔ پروفیسر احتشام حسین تہذیب اور قومی ادب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "ادب تہذیبی زندگی سے اسی وقت تعلق رکھتا ہے جب وہ اپنے اندر ہر قوم کی منصفانہ اور انسان دوست تمناؤں کا اظہار کرے۔ اس کے کسی ایک طبقے کی جارحانہ اور ظالمانہ خواہش کبھی تہذیب اور ادب کا جزو نہیں بنا سکتیں"۔(۱)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ادب کا ایک بڑا حصہ افراد کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اور اعلی درجے کی تخلیق فنکار اور ادیب کی شخصیت کو نمایاں کرتی ہے۔ کوئی بھی تخلیق سماجی تبدیلیوں سے متاثر ہو کر ہی وجود میں آتی ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ادب اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور معاشی مسائل کی کشمکش کو نمایاں کرتا ہے۔ کسی بھی قوم کا ادب اس کی تہذیب و ثقافت لوگوں کے رہن سہن، اور رسم و رواج کی حقیقی تصویریں پیش کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح انور سن رائے کی تحریریں بھی اپنے دور کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورتحال کی آئینہ دار ہیں

انور سن رائے اردو ادب کے ممتاز ادیب، شاعر، مترجم اور صحافی ہیں۔ وہ بحیثیت صحافی کئی اداروں سے منسلک رہ چکے ہیں۔ پاکستانی سیاسی اور ادبی تاریخ پر ان کا تجربہ یک سطری صورت میں بھی کسی کتاب سے کم نہیں ہوتا۔ بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ انور سن رائے کا ناول "چیخ" مزاحمتی ادب میں اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ انہوں نے اس ناول میں میں مارشل لاء اور اس کے جبر و استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے کھلے الفاظ میں آمرانہ حکومت کی پر تشدد کارروائیوں کی عکاسی کی ہے۔ آمریت کے ملک و قوم پر مرتب ہونے والے اثرات کو انہوں نے جرات مندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ ایک نڈر اور بے باک صحافی ہونے کی حیثیت سے پاکستانی سیاست کے تلخ حقائق منظر عام پر لائے ہیں۔ ان کی ادبی تخلیقات میں دو ناول (چیخ اور ذلتوں کے اسیر) اور تراجم (محمود درویش اور ادونیس کی نظموں کا ترجمہ) شامل ہے۔

انور سن رائے کے دونوں ناولوں کے موضوع نہایت اہم اور نازک ہیں۔ یہ ایسے موضوع ہیں۔ جو بر موقع و بر محل اور سماج کا المیہ بن چکے ہیں۔ ناول "چیخ" ناول کا موضوع آمریت، جبر و استحصال اور تشدد جیسے مسائل ہیں۔ یہ ایسے مسائل ہیں۔ جن سے پاکستانی عوام قیام پاکستان سے لے کر اب تک نبرد آزما ہے۔

اگر اردو ادب کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مزاحمتی ادب سے متعلق تحریریں نسبتاً کم ملتی ہیں۔ بلکہ یہی نہیں پاکستان میں رونما ہونے والی عوامی اور سیاسی تحریکوں پر مواد بہت کم ملتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان تحریکوں پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اور دوسری وجہ ہماری زیادہ تر سیاسی تاریخ، ہمارے حکمران طبقے اور فوجی افسروں کی لکھی ہوئی تحریروں اور انکے اپنے بیانیے پر مبنی ہے۔ ان تحریروں میں عوامی تحریکوں کا ذکر تو ایک طرف ہمیں ان میں عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی نہیں ملتی۔ ہمارے پاس ان عوامی تحریکوں کا احوال عوامی رہنما، ادیبوں اور دانشوروں کی تحریروں کی صورت میں موجود ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اردو شعر و ادب میں ہیت اور اسلوب کے تجربوں کے ساتھ موضوعات کے تنوع نے بھی اردو ادب کو وسعت عطا کی۔ شاعری جو صرف گل و بلبل کے قصوں تک محدود تھی۔ سماجی، سیاسی صورتحال کو بھی اپنے دامن میں سمیٹنے لگی۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی گئی تو ادب میں نچلے طبقے اور مزدوروں کی حالت زار کو بھی شامل کیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد طبقاتی تقسیم نے معاشرے کو سیاسی، سماجی اور فکری بحرانوں میں دھکیل دیا۔ اس پر مستزاد ۱۹۵۸ء میں لگنے والے مارشل لاء نے ابتر معاشرتی حالات کو سنبھالا دینے کی بجائے اس کی جڑوں کو مزید کھوکھلا کر دیا۔ پھر ۱۹۶۲ء میں دوسرے مارشل لاء کے بعد پہلی بار منتخب سیاسی حکومت قائم ہوئی۔ مگر ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء نے اس کی بساط کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ یہ مارشل لاء پاکستانی تاریخ کا انتہائی المناک مارشل لاء ثابت ہوا۔ چونکہ یہ مارشل لاء غیر آئینی، غیر قانونی اور بلاجواز تھا۔ اس لیے اس کے خلاف شدید رد عمل ہوا اس رد عمل نے شعر و ادب میں مزاحمتی ادب کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اس آمرانہ دور کے خلاف ادیبوں اور شاعروں نے کھل کر احتجاج

کیا۔ ۱۹۷۹ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد احتجاج کی ایک نئی صورتحال سامنے آئی۔ ادب میں احتجاج علامتی اور استعاراتی پیرائے میں ظاہر ہونے لگا۔ رشید امجد ۱۹۷۹ء کے بعد کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

> "بھٹو کی پھانسی نے مزاحمتی رویے کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ۱۹۷۹ء اور بعد کے دو تین سالوں کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ غزل کے محبوب نے ایک نئی معنویت اختیار کر لی ہے۔ رقیب، آمر اور قتل گاہ پھانسی گھاٹ کے معنی اختیار کر چکے ہیں"۔(۲)

فوجی مارشل لاء اور ریاستی جبر و استبداد پر مبنی انور سن رائے کا ناول "چیخ" مزاحمتی اور احتجاجی ادب کے حوالے سے خاصے کی چیز ہے۔ لیکن افسوس اس ناول کو وہ اہمیت اور مقام و مرتبہ حاصل نہ ہو سکا جو اس کا اصل حق ہے۔ ان کے ناول کی اشاعت سے پہلے اور بعد میں ہمیں ایسی بہت سی تحریریں ملتی ہیں۔ جن میں مزاحمت کا رنگ نمایاں ہے۔ ان تحریروں میں الگ الگ انداز سے آمریت، ریاستی جبر و تشدد اور ظلم و ستم کو بے نقاب کیا گیا ہے لیکن انور کے ناول کو اس لحاظ سے بھی نمایاں مقام حاصل ہے کہ اس ناول کو مارشل لاء کے خلاف پہلی ادبی ایف آئی آر قرار دیا گیا ہے۔ ایک ادیب کے لیے یہ سب سے مشکل اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سامنے رونما ہونے والے ظلم و ستم اور جبر و استحصال کو شاعری یا نثر کی صورت میں صفحہ قرطاس پر اس طرح منتقل کریں کہ صرف وہ حاکم وقت کے عتاب سے محفوظ رہے بلکہ اس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی ہو سکے۔ اس حوالے سے اگر "چیخ" ناول کو دیکھا جائے تو انور سن رائے نے اس ناول کے ذریعے اپنے جذبات و احساسات کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

انور سن رائے نے دیگر قلم کاروں کی طرح فوجی آمریت کے خلاف علامتی انداز نہیں اپنایا بلکہ ایک نڈر اور بے باک صحافی اور ادیب کی حیثیت سے آمریت کو کھل کر بے نقاب کیا ہے۔ آج جس طرح کے حالات سے پاکستان کی عوام گزر رہی ہے۔ اس میں اظہار رائے پر پابندی عائد ہے۔ صحافیوں اور ادیبوں کو نا صرف دھمکیاں دی جا رہی ہیں بلکہ انہیں قتل بھی کر دیا جاتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ کہ یا تو ادیب اور صحافی سچ لکھنا چھوڑ دیں یا پھر صرف وہی لکھیں جس کی اجازت ریاست یا ریاستی ادارے دیں۔ یعنی ان کے بیانیے سے اختلاف نہ کیا جائے۔ لیکن جب آزادی اظہار پر قدغن لگی تو شاعر اور ادیب بلبلا اٹھے۔ انہوں نے واضح اور علامتی دونوں انداز سے اس پابندی کے خلاف احتجاج کیا۔ ایسا ہی احتجاج انور سن رائے نے ناول "چیخ" کے ذریعے ریکارڈ کرایا ہے۔ انہوں نے ناول کے مرکزی کردار کا نام "غلام" علامتی طور پر لیا ہے۔

ناول کا مرکزی کردار غلام پاکستانی عوام کی علامت ہے۔ جو صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ بظاہر انگریزوں سے آزاد ہو چکے ہیں مگر ذہنی طور پر ابھی بھی غلام ہیں۔ غلام ایسے ہی غلاموں کی علامت ہے۔ یہ ناول ریاستی جبر و استحصال کی داستان ہونے کے ساتھ ساتھ اذیت و تشدد کا دل خراش نوحہ بھی ہے۔ انور سن رائے نے ایک قیدی کے جذبات و احساسات اور اس کے ساتھ روا رکھے جانے والے پر تشدد رویوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری بھی خود بخود غلاموں کے ساتھ اس کے نوحے میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھر یہ "چیخ" محض غلاموں کی چیخ نہیں رہتی، بلکہ پورے معاشرے کی چیخ بن جاتی ہے۔ ناول میں انور سن رائے نے عدالتی نظام، منصفوں اور پیش کاروں کی بے حسی اور ان کے بے رحمانہ کردار کو بھی طنز کا نشانہ

بنایا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے عدالتی نظام کی بنیادیں ہی غیر منصفانہ اقدار پر استوار ہیں۔انور سن رائے نے نہ صرف اس پر قلم اٹھایا ہے بلکہ کہ ان کا تجزیہ بھی ناقدانہ انداز سے کیا ہے:

> "جنابِ عالی!۔۔۔آپ انصاف کے عظیم مرتبے پر فائز ہیں۔میں ایک ادنی ملزم اپنی تمام عدم توجہ اور غفلت کے اعتراف کے ساتھ،آپ سے معمولی توجہ کی گزارش کرتا ہوں،آپ کی مسلسل نیند مجھے ایک نئی ناانصافی کا شکار بنا سکتی ہے،خدا کے لئے صرف ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھ لیجئے آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔۔۔۔آپ پوری بات از خود سمجھ جائیں گے۔پوری بات کو سمجھانے کے لئے آپ میں سے کسی ایک کا صرف ایک بار آنکھ کھولنا، محض پلک جھپکنا بھی کافی ہو گا۔"(۳)

ناول میں مارشل لاء اور اس سے پیدا ہونے والی صورت حال کو بیان کیا گیا ہے کہ تیسری دنیا کا یہ خطہ سیاسی اور سماجی جبر و استبداد کا شکار ہے۔اپنے قیام کے آغاز سے ہی اس خطے کو مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ان مسائل میں فسادات، ہجرت، سیاسی افراتفری اور ابتری جیسے مسائل شامل ہیں۔بد قسمتی سے ہمارا سیاسی نظام مضبوط بنیادوں پر استوار ہی نہیں ہو سکا، بلکہ طاقت ور طبقے نے اسے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے ہی نہیں دیا۔جس کی وجہ سے ملک آج تک حقیقی جمہوریت سے محروم ہے۔پاکستان آج جن مشکل حالات سے گزر رہا ہے۔ان حالات میں ہمیں اندرونی و بیرونی دشمنوں کا سامنا ہے۔آج بظاہر ملک کی بھاگ دوڑ جمہوری حکومت نے سنبھالی ہوئی ہے لیکن پس پردہ ہمیں سویلین مارشل لاء کا ہی سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔آج بھی اظہار رائے پر پابندی عائد ہے۔صحافیوں کو نا صرف ڈرایا دھمکایا جاتا ہے بلکہ انہیں قتل بھی کیا جا رہا ہے۔الیکٹرانک اور پریس میڈیا کو خود حکومتی ادارے کنٹرول کرتے ہیں۔ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم ماضی کے مزاحمتی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ ادب زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہر دور کی عکاسی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اس حوالے سے اگر فیض احمد فیض کی نظم "صبح آزادی" کو دیکھا جائے تو بیسویں صدی میں لکھی جانے والی یہ نظم اکیسویں صدی میں پڑھنے والے کو انہی جذبات و احساسات سے دوچار کرتی ہے جن سے بیسویں صدی کا قاری گزرا ہو گا:

"بول کے لب آزاد ہیں تیرے

بول کے سچ زندہ ہے اب تک

بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے"(۴)

ان لفظوں میں گزرے دنوں کی بازگشت آج بھی صاف سنائی دیتی ہے۔بالکل اسی طرح جب ہم انور سن رائے کے ناول "چیخ" کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دور کوئی بھی ہو، حکمران کوئی بھی ہو، ملک میں جمہوریت ہو یا آمریت کمزور طبقہ ہمیشہ سے ہی حکمران اور طاقتور طبقے کا غلام رہا ہے۔اور شاید رہے گا۔کیونکہ ان کے مقدر میں غلامی لکھ دی گئی ہے۔لہذا ظلم و تشدد اور قید ہی ان کا نصیب ہے۔اگر دیکھا جائے تو فوجی مداخلت اور مارشل لاء صرف تیسری دنیا کے ممالک کے مسائل نہیں ہیں بلکہ یہ مسائل اب ترقی یافتہ ممالک میں بھی سر اٹھانے لگے ہیں۔لیکن ان کی شدت اور نوعیت ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں ذرا مختلف ہے۔مثلاً ترکی جیسے ترقی یافتہ ملک میں جب فوج مداخلت بہت ہوئی ہے تو عوام اس کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔پھر آمرانہ قوتوں کے مقابلے میں جمہوریت کی ہی جیت ہوتی ہے۔

جب کہ اس کے مقابلے میں تیسری دنیا کے غریب اور پسماندہ ممالک کی عوام جس طرح ماضی میں طاقتور طبقے سے ہی ڈری اور سہمی ہوئی تھی اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی بالکل اسی طرح آج بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ ان میں اتنی سکت ہی نہیں ہیں کہ وہ اپنی حقیقی آزادی کے لیے جدوجہد کر سکیں۔ اس لیے ان کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے طاقتور طبقہ ان پر حکمرانی کرتا ہے اور انہیں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اگر کوئی ان حکمرانوں کے خلاف بولتا ہے تو اسے ہمیشہ کے لیے غائب کر دیا جاتا ہے۔ اس کی زندہ مثال کراچی جیسے بڑے اور روشنیوں کے شہر سے ملنے والی بوری بند تشدد زدہ لاشیں ہیں۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ناول "چیخ" اپنی اشاعت کو ۳۴ سال گزرنے کے باوجود بھی بروقت اور برمحل معلوم ہوتا ہے۔ آج بھی عوام کو انہی مسائل اور مشکلات کا سامنا ہے۔ جن سے ۳۴ سال پہلے کا پاکستانی شہری گزر رہا تھا۔ اور ایک ادیب کی یہی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے کہ وہ ایسا ادب تخلیق کرے جو نہ صرف زمان و مکان سے آزاد ہو بلکہ جغرافیائی حدود سے بھی ماورا ہو۔ اور انور سن رائے کا یہ ناول ایسے ہی ادب میں شمار ہوتا ہے۔ جو آہستہ آہستہ ادب عالیہ کا درجہ اختیار کر جاتا ہے۔

انور سن رائے نے اس وقت جبر و استبداد اور استحصال کی داستان کو قلم بند کیا جب زبان و بیان پر پابندی عائد تھی۔ انہوں نے "غلام" کے ذریعے پوری پاکستانی عوام کے ساتھ روا رکھے جانے والے ظلم و ستم کا نوحہ بھی بیان کیا ہے۔ آج بھی یہ چیخ صرف غلام کی چیخ نہیں ہے بلکہ ہر مظلوم اور غلام کی چیخ ہے۔ اس ناول کے موضوع نے ہی ناول کو زندہ و جاوید بنا دیا ہے۔ اور بحیثیت ناول نگار انور سن رائے کو بڑے ناول نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے:

"غلامی جرم ہے میں مجرم ہونے کا اقرار کرتا ہوں

میں نے تو اسی میں جنم لیا ہے۔۔۔۔۔

ہمیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں اس کے سوا کچھ نہیں ملا

تم میرے ساتھ اور کیا کرو گے

میں تو پہلے ہی قید میں ہوں

اسی جیل میں جس کی کئی دیواریں ہیں

ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری

تم کہتے ہو تم انھیں ختم کر دو گے

اسی لئے تم مجھے ختم کرنے پر تلے ہوئے ہو

غلامی جرم ہے

میں مجرم ہونے کا اقرار کرتا ہوں" (۵)

"چیخ "ناول غلام ابنِ غلام لوگوں پر طاقت وروں کی طرف سے روا رکھے جانے والے ان مظالم کی کہانی ہے۔ جس کا سامنا پاکستانی عوام نے گیارہ سال کیا۔ ناول کا مرکزی کردار اپنے معنی خیز نام غلاموکے ساتھ پوری پاکستانی غلام قوم کا استعارہ بن جاتا ہے۔ جسے سوچنے کی، اپنی رائے کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ شاید اس جرم کی بھی سزا دی جاتی ہے کہ اس نے احتجاج کرنے کی کمزور سی کوشش بھی کیوں کی۔ جب وہ اپنا نام اہلکاروں کو بتاتا ہے تو وہ غصے سے گالی دیتے ہوئے پوچھتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ تو غلاموا سے غائب دماغی سے جواب دیتا ہے کہ :

"حرامزدہ خود کو غلام سمجھتا ہے اتنی آزادی کے باوجود۔ کہاں سے آئے ہو۔۔۔۔۔ ۔ خیر پور ٹامے والی۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ پاک پتن۔۔۔۔ نہیں۔ تونسہ شریف نہیں اُچ شریف ، بہاول نگر ، کوٹ ادو ، لیہ سیت پور ، علی پور ، منچن آباد ، مظفر گڑھ، فورٹ عباس ، خیر پور ٹامے والی ۔ خیر پور ٹامے والی ۔ خیر پور ٹامے والی ، خیر پور ٹامے والی نہیں ۔ ۔ ۔ نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں کہیں سے نہیں آیا۔۔۔ میں کہیں سے نہیں آیا کہیں سے نہیں آیا ہوتا تو واپس چلا جاتا۔ واپس چلا جاتا۔ واپس چلا جاتا۔"(۶)

انور سن رائے کا دوسرا ناول "ذلتوں کے اسیر "اپنے موضوع اور کے اعتبار سے "چیخ" سے قدرے مختلف ہے۔ اس ناول کا موضوع حوا کی بیٹی ہے۔ وہ چاہے ماں کے روپ میں ہو یا بیوی، بہن اور بیٹی کے روپ میں ہو۔ انور سن رائے نے عورت کا ایک مختلف روپ پیش کیا ہے۔ جو مرد اساس معاشرے میں اپنی بقا کی جنگ لڑتی ہے۔ وہ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی اور سماجی زندگی کی خواہش رکھتی ہے۔ اس ناول کے ذریعے مصنف نے پدر سری نظام کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اور کھل کر اس نظام کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ عورت کو بحیثیت انسان کے مقام دلانے کی کوشش کی ہے جو اس کا اصل حق ہے۔

"ذلتوں کے اسیر "صرف ایک عورت کی داستان نہیں ہے بلکہ دنیا کی ان تمام عورتوں کی کہانی ہے جو نہ صرف مردوں کے ظلم و ستم کا شکار ہیں بلکہ بے جا معاشرتی رسم و روایات کے شکنجے میں بھی کھڑی ہوئی ہے۔ ناول میں انور سن رائے نے ہمارے سماجی، معاشی اور نفسیاتی پہلوؤں پر بھرپور نظر ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ ان پہلوؤں کے مختلف رخوں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ ناول نا صرف مردوں بلکہ عورتوں کی بھی نفسیاتی خواہشوں اور برائیوں کو بیان کرتا ہے۔ اس میں مردوں کی جنسی ہوس کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ مرد عورت کو ہر طرح سے زیر کر کے اپنا غلام بنانا چاہتا ہے۔ اس حوالے سے ناول صرف کرداروں کی نفسیات کو ہی بیان نہیں کرتا بلکہ یہ پورے معاشرے کے منفی رویوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ ناول صرف ثانیہ کی کہانی نہیں ہے بلکہ ثانیہ جیسی ان ہزاروں عورتوں کی کہانی ہے جو ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کی خواہش لے کر مردانہ معاشرے میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہیں۔

ثانیہ کے باپ کا رویہ بیٹیوں کی پیدائش کے حوالے سے ویسا ہی ہے جیسا صدیوں سے پہلے ہمارے معاشرے میں چلا آرہا ہے۔ بیٹیوں کی پیدائش پر دکھ کا اظہار کرنا اور اس حوالے سے بیوی کو طعنے دینا ہمارے مرد معاشرے کا المیہ ہے۔ اس نظام میں مرد حاکم عورت محکوم ہے۔ ہم نے عورت

کو بحیثیت انسان کے تسلیم کرنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ صرف بیوی، بیٹی، بہن اور ماں ہے اس کے علاوہ اگر کوئی اور تعلق ہے تو وہ صرف اور صرف جنسی لذت کوشی کا تعلق ہے۔ ہاں ہمارا معاشرہ عورت کو بحیثیت ماں تھوڑی سی عزت ضرور دیتا ہے۔ بحیثیت عورت وہ اسے عزت کے قابل سمجھنے کو تیار نہیں ہے۔ صدیوں سے رائج اس نظام کے خلاف یورپ میں اٹھنے والی تحریک نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور عورتوں کے مساوی حقوق کے حصول کی جنگ کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس تحریک نے مشرقی معاشرے کی عورت کے اندر بھی بیداری کی لہر پیدا کر دی۔

یورپ میں اس تحریک کو فیمنزم Feminism کا نام دیا گیا جبکہ مشرق میں یہ تحریک تانیثیت کے نام سے مقبول ہوئی۔ اس تحریک نے جہاں زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کیا وہیں ادب پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ عورت باقاعدہ ادب کا موضوع بنی۔ اس موضوع پر خواتین ادیباؤں نے کھل کر لکھا۔ اور عورتوں کی زندگی کے مسائل مثلاً تعلیم، شادی، گھریلو اور معاشرتی مسائل پر بے تحاشا لکھا گیا۔ خواتین ادیبوں کے ہاں صنف نازک کے جذبات واحساسات کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔ خواتین ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ مرد ناول نگاروں نے بھی اس حساس اور نازک موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ان کے ساتھ ساتھ روا رکھے جانے والے سماجی رویوں پر اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ آزادی اظہار پر مذہب کی آڑ میں پابندیاں لگانے پر بھی کھل کر تنقید کی گئی ہے۔ ابتدائی دور کی خواتین ناول نگاروں نے جن میں نذر سجاد حیدر، محمدی بیگم، عباسی بیگم، اکبری بیگم، صغرا ہمایوں اور صالحہ عابد حسین شامل ہیں۔ خواتین کے مسائل مثلاً شادی کے لیے ان کی رضامندی، تعلیم اور وراثت میں عورتوں کے حق کو شرعی اور قانونی حوالوں سے دیکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔

پھر ترقی پسند تحریک کے ذریعے حقیقت پسندی اور روشن خیالی جیسے تصورات نے عورتوں کے خارجی اور داخلی حالات کے جرات مندانہ اظہار کے مواقع فراہم کیے۔ مرد اساس معاشرے میں عورتوں کے سیاسی، معاشی، جنسی، تعلیمی، نفسیاتی اور سماجی پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی۔ مردانہ معاشرے میں خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک ظلم و جبر، معاشرتی ناہمواری اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف قلم کے ذریعے جہاد کرنے والی قلمکاروں میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، رضیہ فصیح اور بانو قدسیہ جیسی ادیباؤں کے نام قابل ذکر ہیں۔

مرزا ہادی رسوا کے ناول "امراؤ جان ادا" مرکزی کردار اور "ذلتوں کے اسیر" ناول کے مرکزی کردار میں گہری مماثلت ہے۔ ثانیہ کا کردار گردش حالات کی وجہ سے امراؤ کے کردار سے مشابہت رکھتا ہے کیونکہ امراؤ کا کردار بھی حالات ہی کا پیدا کردہ ہے بہر حال ثانیہ کے کردار میں امراؤ کے کردار کے مقابلے میں از خود فیصلے کی صلاحیت موجود ہے۔ ثانیہ مروجہ اقدار کے خلاف بھرپور احتجاج کرتی ہے۔ جبکہ امراؤ حالات کے دھارے میں بہتی چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ثانیہ درپیش حالات کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ خود کو بدلنے کی بھی کوشش کرتی دکھائی دیتی ہے۔ مگر اپنی اس کوشش میں وہ ناکام رہتی ہے کیونکہ اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سماجی رویہ ہے۔

اس کے علاوہ اگر "ذلتوں کے اسیر" کا موازنہ عصمت چغتائی کے ناولوں سے کیا جائے تو انور سن رائے نے بھی جنس پرستی جیسے موضوع پر کھل کر بات کی ہے۔ انور سن رائے کا تخلیق کردہ کردار بھی عصمت کے کرداروں کی طرح اپنے حقوق کی پامالی اور مرد کی طرف سے کی جانے والی ناانصافی کے خلاف بغاوت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بحیثیت ماں ثانیہ کا کردار متاثر نہیں کرتا کیونکہ ثانیہ ایک ماں کی حیثیت سے اپنے فطری اور ازلی جذبے سے نظریں چراتے ہوئے اپنی ناسود آرزوں کی تکمیل کے لیے اپنی اولاد کو قربان کر دیتی ہیں۔ یہاں غیر فطری روپ میں قاری کے سامنے آتی ہے اسی قسم کی

صورتحال عصمت چغتائی کے ناولوں میں بھی موجود ہیں۔ ڈاکٹر عظمی فرمان فاروقی اپنی کتاب "اردو ادب میں نسائی تنقید" میں عصمت چغتائی کے ناولوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> ''عصمت کے ہاں ماں اپنے فطری منصب سے آنکھیں چرانے کی کوشش کر رہی ہے اور اپنی خواہشات کے آگے ہار مان لیتی ہے بلکہ کبھی کبھی اپنی اولاد کو اپنی خواہشات کی بھینٹ بھی چڑھا دیتی ہے۔ یہ ماں شمن کی ماں کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ جو صرف اولاد پیدا کرنا جانتی ہے۔ ان کی پرورش کرنا اس کا درد سر نہیں ۔ماں کا یہی تصور "معصومہ" میں بھی سامنے آتا ہے جو اپنی پر آسائش زندگی کے لیے اپنی بیٹی کی عصمت کو خود اپنے ہاتھوں سے قربان کرتی ہے۔ یہی ماں "قیدی" میں ایک اور روپ میں سامنے آتی ہے جب اپنے بیٹے کی کی خوشیاں چھین لینا اپنا حق سمجھتی ہے۔(۷)

بالکل ایسی ماں "ذلتوں کے اسیر" کے مرکزی کردار ثانیہ کے روپ میں سامنے آتی ہے جو اولاد پیدا کرنا تو جانتی ہے مگر اس کی پرورش اور تربیت کو اپنے فرائض میں شامل نہیں سمجھتی کہ وہ انہیں اپنی آزادنہ اور پر آسائش زندگی کی راہ میں حائل رکاوٹ سمجھتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی طرف سے کی گئی زیادتیوں کا بدلہ صرف دیگر مردوں سے ہی نہیں بلکہ اپنی ہی اولاد سے بھی لیتی ہے۔ اگر وہ اپنے ایک بیٹے کو کراچی اپنے پاس لے بھی آتی ہے تو اسے بھرپور توجہ اور محبت نہیں دے پاتیں جس کی وجہ سے اس کا بیٹا اس سے بدگمان ہو جاتا ہے۔

اگر ناول "ذلتوں کے اسیر" کا موازنہ قرۃ العین حیدر کے ناول سے کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے۔ کہ دونوں ناول نگاروں کے ہاں عورت نامساعد حالات کا شکار ہے۔ ثانیہ جو صرف سچی محبت اور خوشگوار گھریلو زندگی گزارنے کی خواہش مند ہے۔ مگر اپنی خواہش کے حصول کے لیے جس طرح کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے یہی حالات بالآخر اس کی موت کا سبب بن جاتے ہیں۔ قرۃ العین کے ہاں بھی عورت اسی طرح کے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے دماغی توازن کا شکار ہو جاتی ہے۔

> "دونوں صورتوں میں ماں کو مرنا پڑتا ہے۔ جب وہ یہ سمجھتی ہو کہ اس کے بچوں کو اس کی ضرورت ہے اور اس کے لیے اپنے بچوں کے پاس رہنا ناممکن بنا دیا جائے تو ماں مر جاتی ہے اور اگر وہ مرنے سے بچنے کے لئے بچھڑنے کا فیصلہ کرتی ہے تب بھی وہ زندہ نہیں رہتی، دیکھنے میں تو وہ زندہ نظر آتی ہے لیکن تب وہ ہر لمحے زندہ ہوتی اور مرتی ہے"۔(۸)

ثانیہ کا کردار ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے مردانہ معاشرے میں اپنی بقا کی جنگ لڑتا ہے ورنہ صرف اپنے ساتھ رونما ہونے والے حملوں کا مقابلہ کرتی ہے بلکہ ہر حملے کے بعد وہ اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے دوبارہ سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کہ ہر امتحان سے گزر کر پر سکون انداز میں آئندہ کا لاحہ عمل تیار کرتی ہوئے آگے بڑھتی ہے۔

آج اگر اکیسویں صدی کے حوالے سے ناول کو دیکھا جائے تو تانیثیتی تحریک کے زیر اثر ثانیہ نے جس طرح اپنے حقوق کی جنگ لڑی اور پدر سری نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا وہ قابل تقلید ہے۔ معاشرہ جہاں مرد کو چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے اور ایک سے زیادہ عورتوں سے تعلقات کی معاشرہ مرد کو آزادی دیتا ہے تو ثانیہ کے نزدیک یہی آزادی عورت کو بھی حاصل ہونی چاہیے:

"مردوں اور عورتوں کے درمیان یہ امتیاز ہے کہ مرد تو چار شادیاں کر سکتے ہیں اور عورت بے چاری دو مرد بھی نہیں رکھ سکتی۔ عورت کو بھی چار چھے مرد رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ تم نے تو شاید کوئی ایسا مرد بھی نہیں دیکھا ہو گا جس کی چار بیویاں ہوں، لیکن میں نے ایسی عورتیں دیکھی ہیں۔ جن کے ایک ساتھ کئی مردوں سے تعلقات ہوتے ہیں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ وہ کس قدر خوش ہوتی ہیں"۔(۹)

ثانیہ مردوں سے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا بدلہ لینے کے لئے معاشرتی حدود و قیود کو بھی پار کر جاتی ہے کیوں کہ اس کا باپ جس کا وہ خون تھی، وہ بھی اس کا نہیں بنتا، چند ٹکوں کے عوض اسے بیچ دیتا ہے۔ ارشد جو اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا وہ بھی اسے دھوکا دیتا ہے۔ تو پھر وہ مردوں کے ساتھ برابری کی سطح کے مقابلے پر اتر آتی ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ اگر معاشرہ مردوں کو چار شادیوں کی اجازت دے سکتا ہے تو پھر یہی آزادی اسے بھی حاصل ہونی چاہیے وہ پدر سری سماج کی طرف سے روا رکھے جانے والے ظلم و جبر پر دیگر عورتوں کی طرح خاموش نہیں رہتی بلکہ اس کے خلاف بھرپور احتجاج کرتی ہے مگر وہ اس نظام کو شکست نہیں دے سکی، جو صدیوں سے رائج ہے اور اس کے خلاف لڑتے ہوئے اپنی زندگی سے ہار جاتی ہے کیونکہ اس کی لڑائی ایک ایسے معاشرے سے تھی جو اس کی تقدیر کا خود فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سیما صغیر اس حوالے سے لکھتی ہیں:

"عورت کی زندگی میں پیدا ہونے والا ہر المیے کو مرد اساس ذہن عین فطرت قرار دیتا ہے بلکہ اس کی تقدیر کا نوشتہ بناتا ہے جبکہ سچ یہ ہے کہ عورتوں کے نہ گفتہ بہ حالات کی تقدیریں خدا نے کم اور مرد معاشرے کے تضادات نے زیادہ لکھی ہے معاشرے کے تضاد کے سبب اُن عورتوں کو اذیت، ناکامی، توہین اور تضحیک مل رہی ہے جن سے وہ اپنی زندگیوں کو قابل برداشت بنانے کے لیے قوت حاصل کر رہی ہیں".(۱۰)

جدید دور میں سوشل میڈیا نے جہاں زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا وہیں خواتین میں بھی شعور بیدار کیا ہے عورتوں نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے اس جدید ٹیکنالوجی سے بھرپور استفادہ حاصل کرتے ہوئے اپنی مسائل کو پوری دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اب عورت پر ظلم و ستم کسی ایک عورت کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ پوری دنیا کی خواتین کا مسئلہ بن چکا ہے اس لیے خواتین کے حقوق کی بحالی کے لیے کی فلاحی تنظیمیں بھی سامنے آچکی ہیں۔ جو خواتین کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے سر گرم عمل ہیں۔

الغرض انور سن رائے کے دونوں ناول بظاہر اپنے موضوع کے اعتبار سے مختلف ہیں مگر ہر دور اور ہر عہد کے مسائل اور حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں آج کسی اکیسویں صدی میں بھی آخری ناول پڑھتے ہوئے قاری ماضی کا سفر نہیں کرتا بلکہ اپنے حال ہی سے اس کی کڑیاں ملاتے ہوئے نتائج اخذ کرتا ہے اپنے موضوع کے اعتبار سے ان کے یہ دونوں ناول زندہ و جاوید ناول ہیں۔

حوالہ جات

۱۔احتشام حسین۔ذوقِ ادب اور شعور۔ لکھنؤ: ادارہ فروغِ اردو، ۱۹۶۳ء۔ ص ۲۶

۲۔رشید امجد، ڈاکٹر۔ پاکستانی غزل کے پچاس سال، مشمولہ، روزنامہ جنگ، (ادبی ایڈیشن) ص ۱۴

۳۔انور سن رائے۔ چیخ۔ کراچی: علم و ادب پبلشر، ۲۰۱۸ء۔ ص ۱۶-۱۵

۴ ۔ فیض احمد فیض۔ نسخہ ہائے وفا۔ نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔ ۱۹۸۹ء۔ ص ۸۱

۵۔انور سن رائے۔ چیخ۔ ص ۱۰۵

۶۔ ایضاً ۔ ص ۱۰۵-۱۰۴

۷۔ عظمیٰ فرمان فاروقی، ڈاکٹر۔ اردو ادب میں نسائی تنقید۔ کراچی: سعید پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔ ص ۵۶

۸۔انور سن رائے۔ ذلتوں کے اسیر۔ کراچی: فضلی سنز لمیٹیڈ، ۱۹۹۷ء۔ ص: ۵ ۲۳

۹۔ ایضاً۔ ص: ۲۷۶

۱۰۔ سیما صغیر، ڈاکٹر۔ تانیثیت اور اردو ادب، روایات، مسائل اور امکانات۔ نئی دہلی: براون بک پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء۔ ص ۱۸